استاد کا کردار

استاد دراصل ایک ایسا نام، تعارف یا لفظ ہے کہ اگر میں مبالغہ نہ کروں (اور میرا گمان ہے کہ یہ مبالغہ نہیں ہے) تو کائنات کی ہر شے اس کے احترام میں کھڑی ہو جاتی ہے، اور کائنات کی ہر مخلوق میں اس نام کے احترام کا کوئی نہ کوئی عنصر موجود ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم لفظ ''معلّم'' پر غور کرتے ہیں تو اس کائنات کی تمام عظیم ہستیاں بنیادی طور پر تعلیم کے فریضے کی ادائیگی کے لیے اس مادی دنیا میں آئیں۔ وہ اپنے مشن، کام اور تعارف کے اعتبار سے معلم اور استاد کہلائے۔ اس حوالے سے آپ مشرق و مغرب کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے، کسی مذہب کی تعلیمات کا جائزہ لیجیے، کسی آسمانی کتاب کے مقدس مندرجات پر نظر ڈالیے، آپ کی تحقیق اس تصور کو قوی تر کر دے گی کہ اس دنیا میں جتنے رسول اور نبی آئے، سب کے سب اپنے کام اور مشن کے اعتبار سے معلم ٹھہرے، اور اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب اپنا تعارف کراتے ہیں تو ہزاروں باتوں میں سے ایک بات آپؐ نے اپنے بارے میں یہی ارشاد فرمائی کہ:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً

(مجھے معلم بنا کر [اس دنیا میں] بھیجا گیا ہے)

دنیا میں جس قدر فلاسفہ اور مفکرین گزرے ہیں، خواہ ان کا تعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے ہو یا آپؐ سے پہلے کی اُمتوں سے، رومن اور یونانی تہذیبوں کے رہنماؤں سے لے کر آج تک کے تمام دانشوروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی اکثریت معلم تھی۔ بلکہ ان میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر (کسی نہ کسی حوالے سے) معلم کا کردار ادا نہ کیا ہو۔ بظاہر باضابطہ درسگاہ سے متعلق نہ ہونے کے باوجود ان کا گھر یا ان کی بیٹھک ایک مستند درسگاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُن کی مجلس ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بقول شاعر

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہرجا کہ رفت، خیمہ زد و بارگاہ ساخت

ایسے لوگ جہاں بھی بیٹھ جاتے تھے درسگاہ قائم ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ طالبانِ علم اور جویانِ حق اس شخصیت کے متلاشی رہتے تھے جو دانش تقسیم کرنے والی تھی۔ اس اعتبار سے تمام فقیہہ اور تمام دانشور معلم تھے۔ اس دنیا میں جتنے بھی روحانی پیشوا گزرے ہیں، خواہ وہ مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والے صوفیا ہوں یا غیر مسلم دنیا کے روحانی پیشوا، ان سب کا بنیادی تعارف تعلیم و تعلم کا ہے۔ اور تو اور دنیا میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات لانے والے اور عسکری قیادت سے متعلق افراد اور سیاسی جماعتوں کے بیشتر قائدین کی بھی ایک بہت بڑی تعداد معلم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ معلم جب میدانِ جنگ میں ہوتا تو اپنی تلوار کی نوک سے تاریخ کے باب رقم کر رہا ہوتا۔ اور جب وہ میدانِ جنگ سے لوٹتا اور زمانۂ امن میں ہوتا تو اس کے قلم کی کاٹ تلوار سے کہیں زیادہ گہری اور مؤثر ہوتی تھی۔ تاریخ ایسے کئی کرداروں کے کارنامے اپنے سینے میں محفوظ رکھتی ہے۔

اس لحاظ سے جب بھی ہم معلم کے کردار کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں تو ہمیں اس تصور کو اپنے ذہن میں ضرور تازہ کر لینا چاہیے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کا فرمان معتبر ہوگا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

فضل العالِم علی العابد کفضلی علٰی ادناکم

یعنی ایک عالم کو ایک عابد پر وہی فضیلت ہے جیسی میری فضیلت ایک عام اُمتی پر ہے۔

کسی بھی معلم (استاد) کے لیے ان الفاظ میں اپنی عظمت واہمیت کا عکس نظر آئے گا۔ جب ہم معلم کے حوالے سے اظہار کر رہے ہوں تو ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے متعلق اس واقعہ سے راہنمائی ملتی ہے، اس میں ایک عظیم سبق ہے۔ خیبر کے قلعے پر اسلامی لشکر کے حملے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان فرمایا: ''کل میں علم لشکر اس فرد کے ہاتھ میں دوں گا جس کے ہاتھ سے قلعہ فتح ہو جائے گا''۔ بہت سے صحابہ کرامؓ یہ اظہار فرماتے ہیں کہ ان کی خواہش تھی کہ یہ پرچم انہیں عطا ہو۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا اور فرمایا کہ ''یہ پرچم تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں''۔ توجہ طلب بات ہے کہ جب ایک سپہ سالار کو قلعے پر حملہ آور ہونے اور اُسے فتح کرنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے تو تعلیم کا انداز تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ کیسے حملہ کرے اور قلعے کو فتح کرنے کے لیے کن کن تدابیر کو بروئے کار لائے، دشمن سے دفاع کیسے کیا جائے اور وار کیسے ہو، وغیرہ۔ مگر آپؐ نے اس موقع پر یہ ارشاد فرمایا:

فواللہ! لان یّھدی اللہ بک رجلاً واحداً خیراً لک من حُمر النَّعم

(اے علی، اللہ کی قسم! اگر آپ کے ہاتھ ایک آدمی سیدھے راستے پر آ جائے تو یہ سرخ اونٹوں کے مالِ غنیمت سے کہیں بہتر ہے)

گویا حضرت علی کو یہ سبق دیا جا رہا تھا [یا ان کے ذریعے سے انسانیت کو یہ باور کرایا جا رہا تھا] کہ اسلام کے فروغ کے لیے ہم انسانوں کے قتل کو مرغوب نہیں رکھتے، بلکہ اصل مقصد انسانیت کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی ہے۔ ابوعمامہؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ وملٰئکتہُ واھل السمٰوٰت والارض حتٰی النملۃ فی جحرھا والحوت فی البحر لَیُصلُّون علی معلم الناس الخیر

(بے شک اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، زمین وآسمان کی سب مخلوقات، حتیٰ کہ بلوں میں موجود چیونٹیاں اور سمندر کی مچھلیاں سب اس معلم کے لیے دعا کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے)

اس بیان میں لفظ '**مُعلِّم الخیر**' بڑا وسیع المعانی لفظ ہے۔ کیونکہ اس میں یہ نہیں کہا کہ جو قرآن، فقہ اور حدیث وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ جو بھی خیر کی تعلیم دیتا ہے، اس کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ اس حکم کا تجزیہ کریں تو شعبہ طب سے متعلق لوگ انسان کو امراض اور اس سے منسلک تکلیف سے چھٹکارا دلانے کے لیے کام کرتے ہیں، لہٰذا اُن کی تعلیم بلاشبہ خیر کی تعلیم ہوگی، کیونکہ لفظ ''خیر'' کا تعلق دنیا کے ہر فن اور ہر شعبے سے ہے۔ گویا جس نے بھی انسانی بہبود اور بھلائی سے متعلق کوئی بات سیکھی اور اُسے دوسروں تک پہنچا دیا اس پر ''معلم الخیر'' کی تعریف لاگو ہوتی ہے۔ چنانچہ کائنات کی ہر شے ایسے فرد کے لیے دعا کرتی ہے۔ اس مرحلے پر آپ کو میرا وہ پہلا جملہ یاد آئے گا جس میں میں نے کہا تھا کہ ''معلم'' کے احترام میں دنیا کی ہر شے کھڑی ہو جاتی ہے۔

لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد دنیا میں موجود ہے جو معلم کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ مگر ان میں سے اکثریت کے خیال میں معلم کا کام محض سابقہ زمانے کے افراد سے حاصل کردہ معلومات اور تجربات کو اگلی نسل تک پہنچانا ہی ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی وہ دو نسلوں کے درمیان، ان کی علمی دنیاؤں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ مگر حقیقت اتنی سی نہیں ہے کہ وہ صرف ایک نسل کی معلومات یا کچھ لوگوں کے تجربات آنے والی نسل تک پہنچا دے۔ معلم محض مزدور نہیں کہ بلا ادراک ایک جگہ سے کچھ اٹھائے اور دوسری جگہ رکھ دے۔ باغبان کی حیثیت سے اُسے نئی نسل کی تہذیب (تراش خراش) کرنی ہے۔ ایک عربی کہاوت ہے: **خیر الاشغالِ تھذیب الاطفال** (یعنی بہترین مصروفیت بچوں کی شخصیتوں کی تراش خراش ہے)۔ تہذیب کسی باغبان کی طرف سے پودوں کی اس شاخ تراشی کو کہتے ہیں جو پودوں کے ظاہری حسن

میں اضافہ کرنے کے لیے ہو۔ باغبان کے لیے لازم ہے کہ اگر شاخ تراشی اس کا فریضہ ہے تو اُسے باغ کے ایک ایک پودے کی ایک ایک شاخ اور پھول سے آگاہی ہو اور وہ ان کے لیے پریشان رہتا ہو۔ اچھے مالی کو پودوں کی ذرا سی خرابی پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی دیکھ ریکھ میں کوئی کمی رہنے نہ پائے، اس لیے وہ ان کی آبپاشی اور کھاد وغیرہ کی فراہمی کے لیے مصروف رہتا ہے۔ جس طرح باغبان اپنے پودوں کی ایک ایک ضرورت کے حوالے سے پریشان رہتا ہے، اسی طرح ایک معلم اپنے ایک ایک طالب علم کی شخصیت کی پرداخت کے ایک ایک پہلو کے بارے میں مضطرب رہتا ہے۔ گویا اگر کوئی فرد شعبہ تدریس کے ساتھ اس تصور سے منسلک ہوا ہے کہ اُسے ایک نوکری مل گئی ہے جس میں ایک مخصوص مشاہرے کے بدلے بعض سرگرمیاں سرانجام دینی ہیں تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ وہ ملازم ہوا ہے، مدرس نہیں بنا۔ کیونکہ عملِ تعلیم محض ایک پیشہ یا ذریعۂ ملازمت نہیں ہے بلکہ یہ ایک عبادت ہے۔ اور یہ بات محض زورِ بیان کے لیے نہیں بلکہ اس کے مکمل مفہوم پر غور و خوض کرنے کے بعد اسے عبادت کہا گیا ہے۔ جس نے کسی کو ایک لفظ بھی پڑھا دیا ہے، درحقیقت وہ عبادت ہی ہے۔ جب معلم میدان تعلیم و تعلّم میں اترتا ہے تو اس کی نظر میں چند گھنٹے کی مشقت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے تو پوری زندگی ایک مشق ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک عبادت ہے۔ آپؐ نے ایک ایسی بات فرمائی جو سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیے قابلِ غور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو علم رکھتے ہیں اور ان کو نہیں سکھاتے جو علم نہیں رکھتے۔ اور ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو علم نہیں رکھتے اور وہ ان سے نہیں سیکھتے جو علم رکھتے ہیں۔''

اس سے دونوں طرح کے لوگوں کی ذمہ داریوں کا پتہ چلتا ہے۔ جو نہیں جانتے اُنہیں ان لوگوں کے پاس جانا چاہیے جو صاحبانِ علم ہیں اور جاننے والوں کو اپنا علم ان تک پہنچانا چاہیے جو نہیں جانتے۔ یاد رکھیے! فرمان کے انداز میں تاکید موجود ہے، تاکہ اس چشمۂ فیض سے ہر شخص فیض یاب ہو سکے۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اگر اُسے موقع میسر آیا ہوتا تو اس نے اس سے ضرور فائدہ اُٹھایا ہوتا۔ یا کوئی یہ نہ کہے کہ مجھ سے تو کسی نے فائدہ اٹھانا چاہا ہی نہیں۔ یعنی علم دینے اور لینے والے دونوں افراد کا اپنا فرض ہے کہ وہ متعلقہ ذریعے تک پہنچے۔ تعلیم کے حوالے سے پہلے ترغیب دی گئی اس کے بعد اب تنبیہ کی گئی ہے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من کتم علماً یلجمُ بلجام النار یوم القیامة

(جس نے علم کو چھپایا، قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ہوگی)

چنانچہ ایک معلم جس کے پاس علم کا خزانہ ہے، اسے اس علم پر سانپ بن کر نہیں بیٹھنا بلکہ اسے تمام متعلقین اور مستحقین میں تقسیم کرنا ہے اور علم کی اس خاصیت سے بھی آگاہ ہیں کہ اسے جس قدر تقسیم کیا جائے اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ نہ صرف علم بلکہ معلم کی دیگر ذہنی صلاحیتیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ اسی لیے میں نے عرض کیا ہے کہ معلم چند گھنٹوں کا ملازم نہیں۔ معلم علم کے متلاشیوں پر کبھی دروازہ بند نہیں کرتا بلکہ اس کا علم ہی اس کی فیاضی کی بنیاد ہے۔ تاریخِ عالم میں ایسے ایسے نادر روزگار معلمین کا ذکر بھی ملتا ہے کہ ایک نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ علم حاصل کرنے کا شوق ہے مگر اُسے پورا نہیں کر سکتا، کیونکہ مزدوری کرتا ہوں اس لیے وقت نہیں بچتا اور آمدن اتنی کم ہے کہ تعلیم پر خرچ نہیں کر سکتا۔ معلم اس سے برہم ہونے اور اس کی حوصلہ شکنی کی بجائے فرماتے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد سیر کے لیے نکلتا ہوں، اگر تم ساتھ آ جاؤ تو اکٹھے سیر بھی کر لیں گے، تمہارے من میں کوئی سوال ہو تو پوچھ لینا اور میرے ذہن میں کوئی بات ہوگی تو بتا دوں گا۔

اس طرح علم کا سفر ہر حال میں جاری رہتا ہے۔

ایسے اساتذہ اور ایسے طلبہ کے بارے میں کچھ معلومات مطالعے میں آئی ہیں کہ بعض اساتذہ اور طلبہ فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے کا وقت (شاید تہجد اور فجر کی نمازوں کے درمیان) تعلیم و تعلم میں مشغول ہوتے تھے۔ یعنی اس طرح جس قدر استفادہ ہو سکتا تھا اس پر اکتفا

کرتے تھے۔اس مشکل وقت میں ان کے استاد کی خدمت میں حاضر ہونے کی اور کوئی وجہ نہ تھی، سوائے اس کے کہ حصولِ علم کا جذبہ اُنہیں کھینچ لایا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ آج کے حالات میں شام کے وقت کوئی طالب علم آپ سے رابطہ کرے اور کسی مسئلے کے حل میں آپ کی مدد چاہے اور آپ اس کے جواب میں یہ کہہ دیں کہ میں نے کلاس میں پڑھا دیا اور اسی کی مجھے تنخواہ ملتی ہے، لہٰذا اس غیر متعلقہ وقت میں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ سکول، کالج یا یونیورسٹی کے ملازم ہیں، استاد ہرگز نہیں ہو سکتے۔ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں اگرچہ ایسے افراد موجود ہیں جن سے متعلق ان کے طلبہ کے ذہن میں بعض ناگوار یادیں بھی ہونگی، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے نظام میں اچھے اساتذہ کا وجود ہی نہیں۔ ایسے استاد کو جو طلبہ کے بعد از کلاس سوالات سننے کو تیار نہ ہو، آپ کچھ بھی کہہ دیجیے، استاد نہیں کہہ سکتے۔ ایسے لوگ کسی اتفاق یا حادثے کے نتیجے میں تعلیم جیسے مشن سے منسلک ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد سے علم کے آگے بڑھنے کا امکان نہیں ہوتا۔ لہٰذا معلم کے لیے ہر وقت طلبہ کی مدد اور راہنمائی کے لیے تیار رہنا اس کی پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے مرشد مولانا رومی کا حوالہ دے کر ہمیں سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے مرشد سے دریافت کیا:

علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ　　　کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

پھر مرشدِ رومی کی زبانی استفسار کا جواب بھی دیتے ہیں:

علم و حکمت زاید از نانِ حلال　　　عشق و رقّت عاید از نانِ حلال

یعنی اگر علم وحکمت درکار ہو تو رزقِ حلال کی جستجو کرنی چاہیے۔ اس سے نہ صرف علم وحکمت تک رسائی ہوگی بلکہ اسی سے عفت کے تحفظ کے ساتھ عشق کے میدان میں کامرانی حاصل ہوگی۔ اس سے یہ استنباط ممکن ہے کہ استاد کو عشق سوزِ دروں کا درجہ حاصل ہوگا، اگر وہ اپنے آپ کو دن کے چوبیس گھنٹے اس مشن کا تابع رکھے گا جس نے اُسے یہ ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ اس کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ روزمرہ مصروفیات میں کہیں بھی، یہاں تک کہ دسترخوان پر بھی، کسی کے سوال کو نظر انداز نہ کرے۔ دراصل استاد کے اوقات کو کسی نظام الاوقات کا پابند بنانا ممکن نہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک فرمان اس موقع کی مناسبت سے قابلِ توجہ ہے۔ آپؐ ایک روز لوگوں سے ملاقاتیں کرتے کرتے شام کو فارغ ہوئے اور جب رات کو گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک نیا قافلہ شہر میں اترا ہے اور اس نے پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ آپؐ نے جب گھر سے باہر قدم رکھنا چاہا تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپؐ ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں۔ آرام کیجیے اور کل صبح ان سے ملاقات کر لیجیے گا۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''اس کی ضمانت کون دے گا کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ یہ قافلہ جو اتنی دور سے آیا ہے، اگر میں ان سے نہ ملوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو یہ شکوہ کریں گے کہ مدینہ رسولؐ میں گئے تھے لیکن ہمیں حصولِ علم کا موقع نہ مل سکا۔'' یہ ہمہ وقت درس وتدریس کے لیے تیار رہنے کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

استاد کو ہر اعتبار سے قابلِ تقلید اور رول ماڈل (آئیڈیل شخصیت) ہونا چاہیے۔ موجودہ زمانے کی بات کیا کریں۔ اس زمانے کی بات کر لیتے ہیں جب غربت اور فقر ہر جگہ موجود تھا۔ بہرحال سہولیات کا جو ماحول آج ہے وہ آج سے نصف صدی قبل موجود نہ تھا۔ آج سے نصف صدی قبل بھی ہم نے دیکھا کہ جو گاؤں کا استاد اور سب سے کم تنخواہ لینے والا فرد تھا، جو فقر اور تنگدستی کے عالم میں رہتا تھا، لیکن اس معلم کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوتے تھے۔ بھلے سے سادہ کیوں نہ ہوں مگر انہیں صاف ستھرا رکھنے کی خاص طور پر کوشش ہوتی تھی۔ چاہے وہ پرائمری سکول کا استاد ہی کیوں نہ ہوتا، صاف ستھرا لباس پہنتا۔ گویا یہ اس کی ضرورت تھی۔ جب وہ کسی دوکان پر جاتا تو دوکاندار اپنی کرسی جھاڑ کر اس کی خدمت میں پیش کرتا کہ استاد کے احترام میں کمی نہ آنے پائے، جو استاد کے لیے معاشرے کا ہر فرد اپنے دل میں رکھتا تھا۔

درحقیقت اس وقت کے استاد کے شہرِ دل میں صفائی ستھرائی کا اہتمام تھا۔اس اندرونی دنیا میں بڑی پاکیزگی اور طہارت موجود ہوتی تھی، جسے کوئی میلا کرنے کی جرأت نہ کر پاتا تھا۔اور مزے کی بات یہ کہ اس کے باطن کا حسن اس کے ظاہر سے جھلکتا تھا۔گویا یہ طے ہے کہ استاد ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے بڑا خوش جمال، مہربان، شفیق، معاملہ فہم، نرم مزاج، صابر ہو۔ان اصطلاحات میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر اصطلاح پر کتاب پیش کی جاسکتی ہے مگر آپ سب جانتے ہیں کہ یہاں صابر سے کیا مراد ہے۔

ایک بچہ بظاہر بڑا احمقانہ سوال پوچھتا ہے اور استاد جب اس کی حماقت کو عمر کا شاخسانہ سمجھ کر نظر انداز کرتا اور سوال کا جواب فراہم کرتا ہے تو استاد کی درگزر کی صلاحیت کا احساس ہوتا ہے۔لیکن جب احمقانہ سوال وہ بچہ بار بار دہرائے اور ہر دفعہ استاد اتنی ہی شفقت اور مسکراہٹ کیساتھ جواب فراہم کرتا ہے تو آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ اس رویے کو قائم رکھنے کے لیے کتنی بے پناہ اخلاقی قوت (moral energy) صرف کرتا ہے۔اور اپنے غضب پر قابو پانے کے لیے اُسے کس قدر جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔بجائے اس کے کہ استاد کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار نظر آئیں، وہ بچے کی کم فہمی سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ طریقہ بدل بدل کر مفہوم بچے کے ذہن میں واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہاں استاد کا حوصلہ بالکل اس ماں کی طرح ہے جو اپنے بچے کی ناجائز ضد کو سنتی ہے، مگر اس کے دل میں مایوسی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔اور اگر تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو بھی جائے تو فوراً ہی اس پر پریشان ہونے لگتی ہے کہ وہ پریشان کیوں ہوا۔

ہم اگر اپنے لڑکپن کے experiences یاد کریں تو ہماری یادداشت میں ایسے واقعات flash back ہوتے ہیں جب استاد نے اچھے (ذہین) طلبہ کی کوتاہی پر سزا کو لازم قرار دیا۔جب اس نے کسی لڑکے کو چھڑی لانے کے لیے بھیجا بھی تو آہستہ سے اُسے ہدایت بھی کر دی کہ دیکھو نرم چھڑی لانا۔دیکھنا اس پر کوئی گانٹھ نہ ہو، کوئی کانٹا نہ لگا رہ گیا ہو۔یہ اہتمام کس لیے ہے؟ ظاہر ہے اس لیے کہ استاد بچے کا دشمن نہیں ہے، وہ تو اس (بچے) کی بھلائی چاہتا ہے۔سزا یوں دینا چاہتا ہے کہ اُس سے اُسے امیدیں وابستہ ہیں۔لہٰذا وہ اُسے جھنجھوڑنا اور جگانا چاہتا ہے، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے، انہیں ضائع نہ جانے دے۔گویا استاد کو مجسم محبت ورحمت ہونا چاہیے، جب وہ خلوص دل کے ساتھ درس وتدریس کیساتھ منسلک ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں ایسی خوبیاں خود بخود پیدا ہونے لگتی ہیں۔

درحقیقت جب ایک معلم اپنے مضمون پر مکمل گرفت رکھتا ہو تو اس میں ایک خاص اعتمادِ ذات پیدا ہو جاتا ہے اور وہ متبادل طریقِ تدریس کے استعمال کی جرأت کرنے لگتا ہے۔لہٰذا ایک اچھے استاد کی مطلوبہ خوبیوں میں سے یہ سرِ فہرست ہے کہ اُسے ماہر مضمون ہونا چاہیے۔اگر آپ کسی استاد کے متشدد رویے کا تجزیہ کریں تو آپ کو بآسانی ادراک ہو جائے گا کہ استاد کا یہ رویہ خود اپنی کسی کمزوری اور خامی کو چھپانے کی ایک بچگانہ سی کوشش ہوتی ہے۔بچہ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے استاد کے ساتھ ایک ذہنی ہم آہنگی کبھی قائم نہیں کر پاتا۔سزا ایک منفی رویہ ہے جو طالب علم کو استاد سے دور لے جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ معلم محض اپنے ذاتی مضمون میں ہی ماہر نہیں ہوتا بلکہ اس کا دائرۂ علم ومہارت وسیع ہوتا ہے۔وہ چند فارمولے رٹ کر میدانِ تدریس میں نہیں اترتا بلکہ ہر نئی بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔اور جب وہ آخر پر طلبہ سے جائزے کے سوال پوچھے تو اُسے بخوبی اندازہ ہو جانا چاہیے کہ طالب علم کے عملِ تعلم میں کہاں کہاں خامیاں رہ گئی ہیں۔ان میں کس کس خامی کی ذمہ داری استاد کی صلاحیتِ تدریس پر ہے اور کون کون سی دیگر عواملِ تدریس پر مبنی ہیں۔استاد کو ہر شعبۂ علم سے متعلق کم از کم ابتدائی معلومات ضرور حاصل کرنی چاہئیں۔چونکہ اس نے طالب علم میں بعض بنیادی صلاحیتوں کو inculcate کرنا ہوتا ہے، اس لیے جب تک وہ خود ان سے متعارف نہیں ہوگا، طالب علم کی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔اُسے اپنے ملکی حالات اور علاقے کی روایات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔سب سے بڑھ کر اپنے طلبہ کی ضروریات سے آگاہ ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ اُسے عالمی سطح پر رونما ہونے والے انقلابات اور تبدیلیوں کا بھی کافی حد تک ادراک ہونا چاہیے۔

جب استاد ریاضی یا ادب پڑھا رہا ہو اور حیاتیات کے ذیل میں جمادات و نباتات کے بارے میں وسیع معلومات اور تجربے کا حامل ہو تو اس کے مجموعی تأثر میں بے پناہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ متنوع شخصیات کے طلبہ متنوع موضوعات پر سوال پوچھ سکتے ہیں، جو اگرچہ اس کے خاص مضمون کے پوری طرح تابع نہ ہونگے مگر ان سے علمی تعلق ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہ طلبہ کے سوالات رد کرنے کی غلطی سے خود کو بچا سکتا ہے اور اس کے بارے میں متعلقہ موادِ تعلیم کی طرف طلبہ کی راہنمائی کر سکے گا۔ ادارے، لائبریری یا دوکان کے بارے میں بتا سکے گا جہاں سے اس مواد کی فراہمی ممکن ہو۔ ایسا استاد جب اپنے خصوصی مضمون کے بارے میں reading material تیار کر رہا ہوگا تو بھی یہی اضافی معلومات اس کی معاونت کر سکیں گی اور ان کے تأثر میں بھی بے پناہ اضافے کا سبب بن سکیں گی۔ ایک استاد کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنا مطالعہ نہ صرف جاری رکھے بلکہ حتی الامکان اسے وسعت دیتا رہے۔ اکثر لوگوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کیسے استاد ہیں؟ اس کے لیے سب سے اہم factor یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ اس کے گھر میں عمومی مطالعے کے لیے کتابوں کی کتنی تعداد موجود ہے۔ یعنی جس کے گھر میں جس قدر کتابیں ہونگی وہ اتنا ہی کامیاب استاد ہوگا۔ گویا اس کی کامیابی کا سب سے زیادہ دارومدار اس کے مطالعے کی مقدار پر ہے۔ ایسا مطالعہ جو درسی کتب کے علاوہ دیگر ماخذ سے ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ استاد کا تعلق اگر کتاب سے نہ ہو یا نہ رہا ہو تو وہ اچھا استاد نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کی علم دوستی وقتی اور کمزور ہوگی تو اس کا طلبہ کے ساتھ تعلق بھی ادھورا اور کھوکھلا ہوگا۔

ذاتی مطالعے میں کتاب کا کردار بنیادی نوعیت کا ہے، لیکن اس مطالعے کو وسعت دینے میں ایک بہت اہم طریقہ یہ ہے کہ اپنے رفقائے کار کے پاس جب وہ بیٹھے تو وہ علمی موضوعات پر بحث کرنے کا عادی ہو۔ سٹاف روم میں عام مشاہدے کے مطابق زیادہ تر گفتگو فضولیات سے متعلق ہوتی ہے۔ جس میں زیادہ تر پلاٹوں کی خرید و فروخت یا کسی side business سے ہونے والی آمدن موضوع بحث رہتی ہے۔ حالانکہ ایسی محفلوں میں اگر تدریسی تجربے کے مختلف پہلو زیر بحث لائے جائیں اور ان کے نتیجے میں تعلیمی مسائل مثلاً زیادہ تعداد کی کلاس پر کنٹرول، مخصوص مضامین کے منتخب مشکل حصوں کی تدریس پر تجربہ کار اساتذہ کی راہنمائی جیسے عوامل شامل ہوں تو self-development کا سلسلہ بڑی کامیابی سے چل سکتا ہے۔

بعض تعلیمی اداروں میں سالہا سال گزر جاتے ہیں اور ایسی علمی محفلیں منعقد کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ بعض اوقات علم نہ ہونے کی وجہ سے علم ختم ہونے لگتا ہے اور بعض اوقات علم کو بروئے کار لائے بغیر علم کا اثر زائل ہونے لگتا ہے۔ علم کو عمل کی بنیاد پر بہتر بنانے کی کوشش جاری رہنی چاہیے۔

معلم اور سزا کے حوالے سے بعض وضاحتیں پیش کی گئی ہیں۔ یہاں صرف ایک آخری بات کہتے ہوئے بات کو مکمل کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس حوالے سے مثالیں تو بہت ہیں مگر ان میں سے صرف ایک مثال پر غور کیجیے۔ اسلام آباد کے ایک گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ مغرب کا وقت تھا، ہم لوگ نماز سے فارغ ہو کر گپ شپ کر رہے تھے۔ معززینِ علاقہ میں سے ایک صاحب میرے ساتھ تھے۔ وہ کہنے لگے کہ سامنے جو پرائمری سکول نظر آ رہا ہے اس کے واحد معلم اس وقت جیل میں ہیں۔ اس جملے پر میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ مدرسے کے بعض طالب علم مدرسے سے بھاگ جاتے تھے، تو استاد نے بچوں کے پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ ہر زنجیر کے سرے پر لکڑی کا ایک بھاری ٹکڑا منسلک تھا۔ اسے اٹھا کر بچے پانی وانی پینے کے لیے مقامی طور پر حرکت کر سکتے تھے، لیکن اُسے اٹھا کر دور تک جانا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چند روز قبل ایک بچہ جو دلبرداشتہ ہو چکا تھا، اُس نے مدرسے سے بھاگنے کے لیے دیوار پھلانگنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کی تاریکی میں اس نے پہلے لکڑی کا وہ ٹکڑا دیوار کے پار پھینکا جو اس کی زنجیر کے دوسرے سرے پر منسلک تھا اور پھر اس کے اوپر ہی خود بھی چھلانگ لگا دی اور لکڑی کے ٹکڑے سے ٹکرانے کے باعث بچہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اور نتیجہ یہ ہے کہ اب استاد جیل میں ہے۔

اسی حوالے سے ایک نوجوان طالب علم کا ذکر بھی مفید ہوگا۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر کا کڑیل جوان مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے متواتر آنے لگا اور ایک دن اس نے بتایا کہ اُسے احساس ہے کہ ایک ہی جیسی باتیں جاننے کے لیے اُسے بار بار آنا پڑتا ہے۔ مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ جو کچھ سنتا ہے، وہ زیادہ دیر تک اس کی یادداشت کے خانے میں نہیں رکتا۔ اس لیے اسے جلدی جلدی لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ جب میں نے اس کی یادداشت کے اس نقص کی وجہ پوچھی تو اس نے یہ انکشاف کیا کہ ایک دفعہ دورانِ درس اس کے استاد نے اُسے کسی غلطی کی سزا دینے کے لیے ایک موٹی لکڑی اس کے سر پر دے ماری تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن سے اس کی یادداشت ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔

اگر سزا کو اس طرح فروغ دیا جائے جس میں بچہ بزدل ہو جاتا یا اعتمادِ ذات سے محروم ہو جاتا ہے یا مایوسی کے باعث تعلیم میں پیچھے رہ جاتا ہے، تو ذرا بڑا ہو کر وہ باغی ہو جائے گا۔ اور جب وہ باغی ہوگا تو معاشرے سے انتقام لے گا۔

معلم اور کمرہ امتحان کا ذکر بطور خاص کرنا ضروری ہے۔ بعض طالبات نے بڑے دکھ کیساتھ بتایا کہ ان کی ممتحن تین گھنٹے (جو امتحانی پرچے کا مقررہ وقت تھا) اس قدر اونچی آواز میں چیختی رہیں کہ وہ (طالبات) اپنے اپنے خیالات کو مرکوز ہی نہیں کر پائیں۔ ان بچیوں کے بیان کردہ جملوں سے ہی میرے سر میں درد ہونے لگا۔ ذرا غور کیجیے کہ جب وہ خاتون چیخ رہی ہونگی اور بچیوں کے سامنے کیمسٹری جیسا مشکل مضمون ہوگا تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کمرۂ امتحان میں تو حتی الامکان خاموشی کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اس حوالے سے لفظ ''نذیر'' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کا مطلب جو عموماً لیا جاتا ہے وہ ہے ''ڈرانے والا''۔ حالانکہ اس کا اصل مطلب ہے ''خبردار کرنے والا''۔ یعنی نذیر کا مطلب ایسی ہستی ہے جو غلط اعمال کے نقصانات سے انسان کو خبردار کرتی ہے۔ گویا اُسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے۔ یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ یعنی کسی تعلیمی ادارے میں اگر کوئی استاد ٹرم کے آخری ہفتے میں پانچ ابواب پڑھا کر بچوں سے معجزانہ کارکردگی کی توقع رکھتا ہے، وہاں اس ادارے کے منتظم (سربراہ) کا بھی قصور ہے جس نے نظام کا پوری طرح سے معائنہ نہیں کیا اور ایسی خامیوں کا ادراک کر کے ان کا تدارک نہیں کیا۔ اُس نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ٹرم کے ابتدائی ہفتوں میں کیوں کم نصاب پڑھایا گیا اور آخری ہفتہ میں سارا بوجھ جمع کر دیا گیا۔ استاد کے طریقِ کار کا اس طرح تجزیہ کرنا کہ اس کے طریقِ تدریس کا مؤثر ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں، یہ بھی مدرسے کی انتظامیہ (school management) کا ایک اہم کام ہے۔

سوال و جواب

سوال: میں ایک ادارے میں پڑھاتی ہوں جہاں ہمیں ایسے طلبہ سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں عرفِ عام میں prodence child کہتے ہیں، کہ انہیں ڈانٹا جائے تو وہ تعلیم سے اور زیادہ متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر پیار کیا جائے تو اُلٹا بگڑ جاتے (spoil) ہیں۔ ایسے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

جواب: آپ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پیار ایسا کہ بگڑنے نہ دے اور سختی ایسی کہ خوفزدہ نہ کرے بلکہ درمیانی راہ اپنانی چاہیے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر ایسے کسی بچے کو سامنے بٹھا کر میٹھے لہجے میں اس کے اندر جھانکنے والے سوالات کیے جائیں اور اس کے نفسیاتی مسئلے کو چھونے کی کوشش کی جائے تو وہ استاد کے ساتھ ایک ذہنی تعلق محسوس کر کے اس پر بھروسہ کرنے لگے گا۔ لہٰذا وہ آئندہ خود اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش شروع کر دے گا۔ اگر بچے کے اندر کے potential کو کسی مثبت سرگرمی میں صرف کرنے کی راہ نکل سکے تو بچے کے شرارت کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس کا اصل مسئلہ اپنے potential کو صرف کرنا ہے۔ اور سیدھی راہ دستیاب نہ ہونے پر وہ شرارتوں کا

راستہ اختیار کرتا ہے۔

سوال: میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کا لیکچر، جو اگرچہ بہت اچھا تھا، مگر میں نے محسوس کیا کہ آپ کے خطاب کے دو حصے تھے: (۱) اسلامی نقطۂ نظر اور (۲) پاکستان کی صورتِ حال، اور وہ بھی ایلیمنٹری اور سیکنڈری ایجوکیشن کے حوالے سے۔ میرا سوال پہلے حصے سے متعلق ہے، اور وہ یہ ہے کہ تعلیم کو تجارت بنانے کے حوالے سے اسلام کے کیا احکامات ہیں؟ اگرچہ ہم کام بھی کریں تو عبادت شمار ہوگی، مگر کیا وجہ ہے کہ ہم progress کی بجائے regress کر رہے ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے حالات کی خرابی کا جتنا بھی پروپیگنڈا کرلیں، یہ طے شدہ نہیں ہے کہ ہم صرف خرابی ہی کی طرف جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ یہ صرف نقطۂ نظر کی بات ہے۔ اگر آپ خرابیوں کو ہی شمار کرنے لگیں تو آپ کو ہر طرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آئیں گیں۔ اس کے برعکس اگر میں آپ کو اچھائی اور شاندار کارکردگی کی مثالیں دکھانا شروع کردوں تو آپ کو اس قدر مثالیں ملیں گی کہ آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ ماشاءاللہ! پاکستان کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔

انسانی دنیا بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ خرابیوں کی تلاش شروع کردیں تو ان کی بھی کمی نہیں ہے۔ اچھائیاں اور خامیاں ہر دور میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور معلم نے ان دونوں کیفیتوں کی موجودگی میں ہی اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیں آئیڈیل سطح پر خوبصورت معاشرہ مل جائے اور اس کے بعد ہم اپنا کام دکھانے کا سوچیں۔ بلکہ یہ تو کمال ہی نہیں ہوا۔ کمال تو تب ہے کہ ہم تمام تر نامساعد حالات کے باوجود نظامِ تعلیم میں قابلِ ذکر کارکردگی دکھاسکیں۔ اسی خرابی کو دور کرنا تعلیم کا اصل مقصد اور استاد کا حقیقی کردار ہے۔ یہ محنت کب رنگ لائے گی، یہ عبادت کرنے والے پر منحصر ہے۔ جب معلم (جو اپنے کام کے ذریعے عبادت میں مصروف ہے)، جب خلوص اور خشوع وخضوع کیساتھ عبادت جاری رکھے گا تو اس کے اندر سے آواز آئے گی اور اُسے خود کار طریقے سے اشارہ ملے گا کہ اس کی عبادت قبول ہے۔ یہ اس کی کامیابی کا اشارہ ہے۔ [اگر اس کی ہدایت کی روشنی میں پوری زندگی میں ایک بھی فرد راہِ راست پر آکر فلاحِ انسانی کی راہ اختیار کرلیتا ہے تو استاد کی محنت کامیاب ہوجاتی ہے، کیونکہ اس کے شاگرد جہاں جہاں اور جیسے جیسے عبادت اور نیکیاں کر رہے ہوں گے اس کا ایک حصہ استاد کے نامۂ اعمال میں آتا رہے گا۔ کیونکہ اس کا بنیادی کام ایک طرح کا صدقۂ جاریہ ہے]۔ اور ایسے ہزاروں معلمین پاکستان میں موجود ہیں اور انہی کی بدولت آپ کو پاکستان میں روحانی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں جہاں آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں کوئی آسمانی مصیبت، سیلاب اور زلزلہ وغیرہ کی صورت میں آئے تو بری مثالوں کے ساتھ ساتھ آپ کو ایسی مثالیں بھی بے تحاشہ نظر آئیں گی جب کسی فرد نے اپنے گھر کا پورے کا پورا سامان ہی اٹھا کر ضرورت مندوں کو دے دیا ہوگا۔ آپ کو ایسے مناظر کثرت سے نظر آئیں گے کہ جب اوجھڑی کیمپ حادثے میں لوگ زخمی ہوئے تو نوجوانوں کی اتنی تعداد خون دینے پہنچ گئی تھی کہ ہسپتالوں کو باہر بورڈ لگانا پڑے تھے کہ مزید خون کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے عطیہ دینے والوں سے معذرت!

آپ جہاں جہاں ایسے مناظر دیکھتے ہیں، آپ کو جان جانا چاہیے کہ کسی استاد نے ان لوگوں کے اندر کے خوبصورت انسان کی شخصیت کی تشکیل کی ہوگی۔ ہمارے لیے کنول کا پھول ایک اچھی مثال ہے کہ اگرچہ کنول کا پھول کیچڑ میں کھلتا ہے اور کیچڑ نے ہر صورت موجود رہنا ہے، مگر کنول نے اپنی پاکیزگی کو اسی حالت میں بحال رکھنا ہے اور یہی اس کا جہاد ہے۔ آپ کا جہاد یہ ہے کہ آس پاس خواہ کتنی ہی برائیاں موجود ہوں، مگر آپ خود کو برائی کے اس دھارے میں بہہ جانے سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس تحفظ کے لیے آپ جتنی بھی جدوجہد کریں گے وہی آپ کا ''جہاد بالنفس'' ہے۔ جس روز کسی فرد نے سوچا کہ آس پاس پھیلی کیچڑ میں اکیلا میں ہی کنول کا رول کہاں ادا کروں، یقین کیجیے اُسی روز وہ پھول سے خار میں بدل جائے گا۔